اُردو ادب کی روایت میں تصورِ انسان

روبینہ یاسمین، پی ایچ۔ڈی سکالر، جی سی یونیورسٹی، لاہور

Abstract

In this article, concept of man in urdu literature is discussed. Urdu, fiction and poetry take interest in presenting man in different perspective.

روسی افسانہ نگار گوگول کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے نہ صرف یہ کہ خود افسانے کا آغاز کیا بلکہ آئندہ اُفسانہ نگاروں کو بھی متاثر کیا گویا گوگول افسانہ نگاری کی تاریخ کا سنگ میل ہے اور وہ سورج جس سے بعد میں آنیوالے افسانہ نگاروں نے روشنی حاصل کی روسی افسانہ نگار اس کے بعد ترجیف پھر چیخوف اور فرانسیسی افسانہ نگار موپاساں جدید مختصر افسانہ کے بانی ہیں ڈاکٹر صادق نے سرسیّد کو اُردو کا پہلا افسانہ نگار قرار دیا ہے مگر ڈاکٹر علی ثنا بخاری نے ان آرا کو یکسر مسترد کرتے ہوئے لکھا ہے:

''حیدر بخش حیدری کہانیاں پیارے لال آشوب کے قصے اور سرسیدہ کا ''گزرا ہوا زمانہ''
ایسے کسی دعویٰ کی بنیاد نہیں بنتے کیونکہ یہ مختصر کہانی کے فن پر پورا نہیں اُترتے۔''[۱]

سرسیّد کو اوّلین افسانہ نگار کا درجہ نہ بھی دیا جائے تو بھی سرسید کا نام ہندوستانی ادب میں نمایاں مقام کا حامل ہے کیونکہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریز ملک کے سیاہ سفید کے مالک تھے اور اہل ہنداُن کے غلام غلامی سے استحصال اور جبر سے تشدد تک کا یہ سفر ہندوستانیوں کے دلوں میں غلامی سے نفرت اور آزادی کا ولولہ پیدا کرنے کو کافی تھا۔مگر کوئی مرکز نہ تھا جہاں ان ولولوں کی عملی تربیت کی جاتی ایسے میں سرسید نے علی گڑھ ہائی سکول اور پھر کالج کی بنیاد رکھ کر غلاموں کو انگریزی تعلیم وادب سے متعارف کروایا یوں علی گڑھ ایک تحریک بن گئی جس نے اہل ہندوستان کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً نئی راہ پر ڈالا اور ہندوستان کی غلام اقوام آزاد دنیا کے افکار وخیالات سے آگاہ ہونے لگیں ۔ جدید اصناف ادب نے اہل قلم کو متوجہ کیا۔سجاد حیدر یلدرم کا نام اس لحاظ سے نمایاں ہے کہ انہوں نے ہندوستانی ادب کو افسانہ سے روشناس کروایا ترکی افسانوں کے تراجم اُردو میں کیے کچھ طبع زاد افسانے بھی لکھے۔ ہلکے پھلکے مزاحیہ انداز میں اپنے خیالات کو اوّلین نقش افسانہ میں پروکر اُردو قارئین کے سامنے پیش کیا۔یلدرم نے ہندوستان کے باپردہ ماحول میں اپنے کرداروں کو فطرت کی ہم آہنگی سے پیش کیا اور تعلیم یافتہ عورت سے متعارف کروایا سب سے بڑھ کر یہ کہ افسانے میں انسان کا ایک تصور پیش کیا۔

یلدرم کی ''چڑیا چڑے کی کہانی، کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو'':

''ہائے ریاکار انسان کہتا ہے سوائے میرے کسی میں حیا نہیں سب جاندار سوائے انسان کے بے حیا

ہیں حیااورشرم کااحساس صرف مجھ میں ہے۔اوہ ڈینگ مارنے والی مخلوق بس بس جسے تو حیا کہتا ہے وہ ریا کاری ہے خدا کے فضل سے ہم سب مساوی میں کسی کو ایک دوسرے کی خدمت کرنے کی ضرورت ہے نہ آرزو، اپنے بال بچوں کے سوا کسی کی خدمت کرنا،کسی کے گھونسلے پر جا کردریوزہ گری کرنا عار کی بات ہے ننگ کی بات ہے مگرانسان وہ مدعیٔ عقل احمق جواپنے تئیں درس آموز قدرت خیال کرتا ہے اس نکتے کونہیں سمجھتا۔''۲

گویا اُردو ادب میں آغاز ہی سے تصور انسان کا موضوع مرکزی نکتہ رہا ہے۔ یلدرم علی گڑھ کالج کے تعلیم یافتہ تھے علی گڑھ کالج کے پروردہ لوگوں میں مغربی تہذیب سے آگاہی نے رومانی تحریک سے متعارف کروایارومانیت کااہم محرک انقلاب فرانس تھا۔ اہل فرانس نے جوعالمی جومساوات کا خواب دیکھا تھا۔جوانقلابی ولولے ذہنوں میں کروٹ لے رہے تھے وہ نپولین کی فوجی آمریت نے سرد کردیئے۔اب انسان جاگتی آنکھوں سے خوشحالی اور مساوات کے سپنے دیکھنے لگا۔ یہ تحریک انسان کی اندرونی اور دبی ہوئی خواہشات کے نتیجے میں ایک خیالی دُنیا کا تصور تھا۔ ہندوستان میں جب مغربی تعلیم اورشعور آیا تو رومانی تحریک نے نئے لکھنے والوں کے لیےادب کے نئے دروا کیےسوچ کا نیاانداز سامنے آیا۔

ڈاکٹر عامر سہیل اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

''رومانی تحریک اُردو میں ایک اہم سنگ میل کی حثیت رکھتی ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز میں اس تحریک نے نئے لکھنے والوں اور ان کے بکھرے ہوئے شعور کوایک نمایاں پلیٹ فارم مہیا کیا، سجاد حیدریلدرم، سجاد انصاری، سرعبدالقادر، اقبال، اختر شیرانی، نیاز فتح پوری، مہدی افادی فراق، مجاز، جوش،فیض نجانے کتنےتخلیق کاروں نے اس تحریک سے اپنے سفر کا آغاز کیا۔''۳

یلدرم کے ہم عصرمہدی آفادی کی رومانیت کازوایہ حواس انسانی کے ادراک کا ہے اُن کا جذبہ آتش فشاں کی صورت ہے اوراس کا مرکز عورت ہے۔ رومانی تحریک نے عورت کوبھی زندگی کی حرکت عمل میں شریک کیا۔ یوں رومانی تحریک نے ادب کوخوبصورت اورلطیف جذبوں سے آشنا کیا۔ یہ ہندوستان کے باسیوں کے لیے بہت بڑا دھچکا تھا۔ کہ تفوق بھرے معاشرے میں خانہ نشین کوسرعام مردوں کے مقابل لاکھڑا کیا کہ وہ بھی جاندار اوراپنے حقوق کی آگاہی رکھتی ہے سجادانصاری اُردو رومانی تحریک کے اہم ادیب ہیں اُنہوں نے کم لکھا کہ زندگی نے مہلت نہ دی مگر جولکھا وہ ان کو ادب میں زندہ رکھنے کوکافی ہے۔سجاد اُنصاری نے ادب میں انسان اورشیطان کو آمنے سامنے لاکھڑا کیا۔ انسان کا تصوران کے یہاں فرشتے اور شیطان کے درمیان ہے کہ انسان چاہےتو پاکبازی میں فرشتوں کے مقام تک پہنچ جائے اور اگرپستی میں جاگرےتو شیطان بن جائے۔ انسان کا اتنا واضح تصوراردو افسانوی ادب میں سجاد نے پہلی بار پیش کیا اور شیطانیت کاایک واضح حل بھی پیش کیا کہ جب شیطانیت ملکوتیت میں بدل جائے گی نہ دُنیا کی ضرورت رہے گی نہ انسان کی۔۴

کتنی خوبصورتی سے کتنی بڑی آفاقی حقیقت کوسجاد نے ایک خوبصورت جملے میں سمودیا ہے کہ کائنات کامنتہائے نظرتوانسان ہے۔فرشتہ اورشیطان تو اس کی دوانتہائیں ہیں ۔ یہ کائنات انسان کے لیے پیدا کی گئی ہے رہے فرشتے تو وہ پہلے سے موجود تھے اور شیطان بھی جوکبھی ان کا سردار تھا۔مگر گمراہ ہوکر انسانوں کوگمراہ کرنا چاہتا ہے شیطان کا کردارسجاد کے ہاں ایک

طاقتور اور دبنگ کردار ہے جو فرشتوں کو طنزاً کہتا ہے۔''نافرمانیاں تم بھی کرنا چاہتے تھے مگر تم میں جرأت ارتکاب نہ تھی''۵

سجاد کا تصور شیطان اقبال کے تصور شیطان سے مشابہت رکھتا ہے اقبال بھی سجاد کی طرح شیطان کو حرکت و عمل کا منبع قرار دیتے ہیں۔ رومانوی تحریک کی ایک عطا یہ بھی ہے کہ ہندوستان میں رومانوی ادیبوں نے عورت کو بھی انسان کا درجہ دیا عورت کی فطرت، اس کی چاہت، اس کی خواہشات کے بارے میں قلم اُٹھایا ورنہ ہندوستان میں عورت محض قربانی کا بکرا تھی اور مرد قصائی کی طرح اس کا مالک جو چاہے سلوک کرے۔ رومانی تحریک کا یہ پہلو بھگتی تحریک کے مماثل بھی کہا جا سکتا ہے کہ جس میں عورت عاشق اور مرد معشوق تھا ورنہ اس سے پہلے اظہار عشق فارسی کے زیر اثر مرد سے عورت کی طرف تھا عورت ہی معشوق تھی گو خیالی مگر یہاں تو عورت جاندار گوشت پوست کی بنی عورت ہے جس کے اپنے جذبات واحساسات ہیں سجاد انصاری لکھتے ہیں کہ عورت کبھی اپنے جذبہ نسوانیت کیا اہانت برداشت نہیں کر سکتی رہی بات عورت کے حجاب کی تو یہ حقیقت بے نقاب ہوئی ہے کہ یہ حجاب عورت پر معاشرے نے ڈال رکھا ہے ورنہ۔

> ''عورت کا حجاب حقیقی حجاب نہیں ہوتا۔ وہ محض ایک طلسم ہے جسے یوسفیت کا ایک انداز توڑ سکتا ہے عموماً لوگ خود اپنی چاک دامنی پر آمادہ رہتے ہیں اس لیے عورت مطمئن ہو کر تغافل شعار بن جاتی ہے''۶

عورت کے بارے میں اس سے پہلے اُردو ادب میں کسی نے اس طرح قلم فرسائی نہ کی تھی۔ سجاد عورت کی فطرت کو کھول کر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں ہر عورت فطرتاً زلیخا ہے لیکن یہ حقیقت صرف اُسی ہستی پر منکشف ہو سکتی ہے جس میں یوسف کی نیز نگیاں پنہاں ہوں گویا مرد کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ عورت صنف نازک ہے اور اس کے ساتھ سختی نہیں نرمی کا سلوک ہو کیونکہ یہ بھی دل اور دل میں جذبات رکھتی ہے سجاد انصاری کی رومانیت صرف خیالی یوٹوپیاً نہیں بلکہ اپنے اندر گہری معنویت رکھتی ہے۔ مذہب کے بارے میں قلم اُٹھانا بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا مگر اس سولی پر چڑھنا کسی نہ کسی کا مقدر ضرور تھا اور یہ سجاد انصاری ہی تھے جنھوں نے خود ساختہ بتوں کو توڑنے کی جسارت کی مذہب کے نام پر انسان نے کیا کیا ستم نہیں ڈھائے اور جن انسانوں کی ہدایت کے لیے خدا نے پیغمبر بھیجے تھے اُن انسانوں پر مذہب کے نام پر جور وستم روا رکھے۔ سجاد انصاری ان مظالم کا پردہ یوں چاک کرتے ہیں۔''حقیقتاً مذہب کے پردے میں ظالم انسان نے وہ سب کچھ کر ڈالا جس کی ممانعت کے لیے خدا کے پیام بر بھیجے گئے تھے۔۷

ہر انسان اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے اب وہ جنت پسند کرے یا دوزخ اس کا اختیار خدا نے انسان کو دیا ہے اور یہ اختیار دے کر کارخانہ کائنات میں عمل کے لیے چھوڑا ہے اس حثیت سے انسان خود مختار ہے سجاد لکھتے ہیں کہ ہر انسان خود اپنی جنت اور دوزخ کی تعمیر کر سکتا ہے گویا انسان حالات کا نہیں حالات انسان کے ماتحت ہیں سجاد کے ہاں اس نظریے کا اعادہ بھی ہے کہ یہ کائنات ایک فریب ہے ایک عکس ہے حقیقت کا ایک پرتو ہے۔ عکس میں حق و باطل تلاش کرنا مجال ہے اُن کے بقول حقیقت یہ ہے کہ انسان نہ حق ہے نہ باطل اس کا جو د محض فریب کائنات ہے۔ یہاں سجاد کی رومانونیت میں فلسفہ وحدت الوجود کا رنگ نظر آتا ہے ڈاکٹر انور سدید سجاد انصاری کے بارے میں کہتے ہیں کہ انہوں نے اردو نثر میں رومانی جملے لکھنے کی طرح ذاتی اور نو بہ نو تاثرات کو اظہار دوام عطا کر دیا، رومانی جملے تو خیر ان کی عطا ہیں لیکن ان کے فن کے ساتھ ساتھ ان کا فکر بھی توجہ کا متقاضی ہے کہ ان کے جملوں میں معانی کا ایک جہاں آباد ہے جو دوسروں کو انسان اور اُس کے طرز عمل پر غور وفکر کی دعوت دیتا ہے سجاد

انصاری کے ہم عصر رومانی شعرا میں نیاز فتح پوری نمایاں نظر آتے ہیں ان کا تصور مسرت کی جستجو میں مصروف انسان ہے ان کا تخیل بلندیوں پر ہے اور فطرت سے حسن کی تلاش کرتا ہے وہ فطرت کے حسن میں اس کے راز پنہاں کو عیاں دیکھنا چاہتے ہیں۔رومانی تحریک میں خیالی ہی سہی مگر انسان کا یہ تصور ہے کہ وہ کائنات کا مرکز ہے اور انسان کائنات کے لیے نہیں بلکہ پوری کائنات خدا نے انسان کے لیے تخلیق کی ہے

رومانی تحریک کے متوازی اُردو ادب میں حقیقت نگاری کی تحریک بھی شروع ہو چکی تھی جس کو رومانی تحریک کی ضد بھی کہا جا سکتا ہے رومانی تحریک خیال وادب کی دنیا تھی جس نے اپنے تخیل کا گوشہ آسمان کی وسعتوں سے جوڑا تھا جبکہ حقیقت نگاری کی اساس ارضی تھی اور زمین پر زندگی کو اس کے اصلی رنگ میں پیش کرنے کی کوشش تھی۔ کیونکہ بیسویں صدی میں عوام اتنے باشعور ہو چکے تھے کہ وہ اپنے حقوق کے لیے جنگ پر آمادہ تھے انقلاب روس نے دُنیا بھر کے محروموں کو اپنے حق کے لیے کھڑا ہونے کا درس دیا چونکہ ہندوستان اور روس کے حالات میں مشابہت تھی یہاں بھی غلامی اور جبر و استحصال تھا۔ لہٰذا ہندوستانیوں کے لیے انقلاب روس ایک خوش آئند حقیقت تھی کہ اب غلامی کی زنجیروں کو توڑا جا سکتا ہے

پریم چند کا نام اُردو ادب کی دُنیا میں اس لحاظ سے بھی نمایاں ہے کہ انہوں نے لکھنے کی ابتدا وطن کی محبت اور غلامی کی لعنت کے خلاف نفرت اُجاگر کرنے سے کی۔ اُن کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ سوز وطن ۱۹۰۸ء میں منظر عام پر آیا۔ اس میں کل پانچ کہانیاں دُنیا کا سب سے انمول رتن شیخ محمود، یہی میرا وطن ہے صلہ ماتم اور عشق دنیا اور حب وطن مشامل ہیں۔ صلہ ماتم کے علا وہ سبھی کہانیاں حب وطن کے رنگ میں ہیں اس لیے یہ کتاب انگریز سرکار نے ضبط کر لی۔ ۸

پریم چند کے ہم عصر ایک انقلابی اور طاقتور آواز علامہ راشد الخیری کی ہے۔ ان کے یہاں مسلمان عورت کے مسائل کا ذکر بھی ہے اور اُس کے پس پردہ عناصر یعنی تعلیم نسواں کی کمی اور مسلمانوں کی جہالت پر بھی ان کی گہری نظر ہے علامہ راشد الخیری کو مصور غم کہا جاتا ہے انہوں نے عورتوں پر ظلم وستم، ان کے معاشرتی مقام اور جائیداو روراثت سے محرومی کو موضوع بنایا ہے یوں حقیقت نگاری ان کا وصف ٹھہری۔ ان کے یہاں تصور انسان کمزور اور مظلوم عورت کا ہے اپنوں کے ہاتھوں دکھ اٹھانے والی عورت مظلوم اس کے باپ بھائی اور خاوند ظالم انسان کا ایک روپ ہیں ''تمغہ شیطانی'' کے افسانوں میں انسان کے روپ پر شیطان بھی عش عش کر اُٹھتا ہیں اور ان ظالموں کو تمغہ شیطانی سے نوازتا ہے۔ ۹

عورت کا دوسرا تصور یہاں محکوم کا ہے جو ہر حالت میں مردوں کی اطاعت پر مجبور ہے پسند کی شادی پر یہ ظالم انسان قتل اولاد پر اُتر آتے ہیں۔ ایسے میں علامہ راشد الخیری انسان کی سفا کی اور سنگدلی کو قصائی سے تشبیہ دے کر اس کے ظلم وستم کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں وہ جاہل و بدبخت قوم جو انسانی زندگیوں کے فیصلے محض ایک گھونگھٹ کی ہوں پر کردے ان سفاک قصائیوں سے کم نہیں جو بھیڑ وں اور بکریوں کے سودے گلوں سے دور اپنی ضرورت کے اعتبار سے کر دیتے ہیں''۔ ۱۰ یہاں خودغرض انسان کا تصور ہمارے سامنے آتا ہے جو اپنی کمینی فطرت اور خود غرضی پر دوسروں کی زندگیوں کے سودے کرتا ہے اور دوسروں کی چاہت کو اپنی انا کی بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔

اُردو میں حقیقت نگاری کی ابتدا پریم چند سے ہوتی ہے انہوں نے کچلے ہوئے طبقات غریب کسان، مزدور، اور عورت کے مسائل کو اپنے حساس دل سے محسوس کیا اور اپنے فنکارانہ قلم سے اس ظلم وستم کو پیش کیا۔ پریم چند کے تصور انسان کی مختلف

جہات ہیں کہیں گنگو برہمن جیسا ان پڑھ سادہ دل اور معصوم انسان ہے جو ایک فاحشہ سے شادی کر لیتا ہے شادی کے چھ ماہ بعد بچہ پیدا ہوتا ہے۔ دنیا کی نظر میں وہ بچہ ناجائز ہے گنگو کی اولاد نہیں مگر گنگو کا فلسفہ سادہ سا ہے وہ کہتا ہے کہ میں نے ایک بویا ہوا کھیت لیا تو کیا اُس کے پھل کو اس لیے چھوڑ دوں گا کہ اُسے دوسرے نے بویا تھا[۱۱] ہندوستانی معاشرہ اور بیسویں صدی کے پہلے نصف میں انسان کا کتنا اعلیٰ تصور پریم چند نے دکھایا ہے کہ جہاں فاحشہ سے شادی ہی ایک جرم ہو وہاں اُس کا بچہ پالنا اُسے اپنانا اور بے وفائی نہ کرنا کیونکہ محبت ہی وہ طاقت ہے جس سے انسان معاشرے اور اس کی اقدار سے ٹکر لیتا ہے۔ کیونکہ ہر انسان کا دوسرے سے بلا رنگ و مذہب وملت ایک رشتہ ضرور ہے اور وہ ہے انسانیت کا رشتہ کہ جس کے سامنے باقی سب ہیچ ہے۔ خانہ برباد کی تارا کہتی ہے کہ آج کے بعد میرے اور تمہارے درمیان صرف انسانیت اور ہمدردی کا رشتہ ہے[۱۲] صرف یہی رشتہ اگر پوری دُنیا میں رہ جاتا تو شائد انسان انسان کے خون کا پیاسا نہ ہوتا اور اپنے ہی ہم جنس کا لہو پانی کی طرح نہ بہاتا۔

پریم چند نے طوائف پر بھی لکھا اور اس کے گاہک پر بھی کہ یہاں انسان کے دونوں روپ انوکھے ہیں ایک جنس کا دوکاندار ہے اور دوسرا خریدار انسانوں کی منڈی میں انسان کا مول تول ہوتا ہے اور یہ رسم قدیم ہے گھناونی سہی پھر بھی ہر انسانی معاشرے میں ہمیں اس کا وجود نظر آتا ہے مگر اس مول تول کا سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ نہ تو خریدار کھرا مال خرید رہا ہے اور نہ ہی دوکاندار کھرا بیچتا ہے دونوں ایک دوسرے کو دھوکا دے رہے ہیں اور دھوکا کھا رہے ہیں مگر جانتے بوجھتے افسانہ سبق کی بھاگا موہن بابو طنزاً کہتی ہے۔

> ''رنڈیوں میں تو کچھ بھی نہیں نہ محبت ہے نہ رحم ہے نہ عصمت وعفت ہے نہ ماتری بھگتی ہے پھر بھی وہ لوگ رنڈیوں کے آگے ناک رگڑتے ہیں جو اپنے دل میں ان تمام اوصاف کے رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں موہن بابو! یادرکھیے مصنوعی محبت دکھانے میں آپ رنڈی سے زیادہ چالاک نہیں ہوسکتے۔''[۱۳]

پریم چند انسانی نفسیات کا کتنا گہرا ادراک رکھتے تھے کہ رنڈی معاشرے کا ناسور۔ کہ جس کے نام سے گھن آتی ہے اُس میں کوئی بھی خوبی نہیں وہ تلچھٹ ہے معاشرے کی مگر اُس کے آگے ناک رگڑنے والے کن اوصاف کے مالک ہیں منافقت اور مصلحت کا یہ رویہ ایک طرف ہمارے معاشرے کی اشرافیہ کے دوہرے معیار کا پردہ چاک کرتا ہے دوسری طرف رنڈی کی فطرت کی عکاسی بھی کی ہے کہ وہاں سب دکھاوا ہے محبت چاہت سب رات کی رات ہے۔ مصنوعی محبت، مصنوعی باس عارضی قربت وقتی جذبات غرض ہر چیز دکھاوے کی ہے گویا رنڈی کا بازار میں ہر چیز دونمبر چلتی ہے انسان کی کتنی پرتیں ہیں اُس کی فطرت کیا کیا رنگ بدلتی ہے خالق کے سوا کوئی نہیں جان سکتا۔

پریم چند نے فطرت کے رنگ اور انسان کے روپ بھی اپنے افسانوں میں بھر دیے ہیں''مزارالفت'' کی سلوچنا رنڈی کی بیٹی ہے رنڈیوں سے ہمدردی اس کے خون میں شامل ہے یہ خون کی تاثیر ہے کہ رنڈیوں کی بےعزتی پر وہ بغاوت پر تل جاتی ہے لیکن یہ سوچ کر کہ دُنیا والے کیا کہیں گے آخر رنڈی کی بیٹی تھی اپنا آپ دکھا دیا بغاوت نہیں کرتی مگر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتی ہے۔[۱۴] یہاں ڈاکٹر رامیندر کا رکردار پڑھے لکھے اور تعلیم یافتہ انسان کا ہے جو رنڈی کو اپنا تو لیتا ہے مگر معاشرے میں اپنی عزت اور ساکھ کو داؤ پر لگتا دیکھ کر اپنی ذہنی پسماندگی کا ثبوت دیتا ہے اور بیوی پر شک کرتا ہے بیوی جان دے دیتی ہے تو پھر تمام عمر شادی نہیں کرتا اس کے مزار سے بھی عقیدت رکھتا ہے کیونکہ یہاں احساس ندامت ہے اس کے اندر کے انسان کا ضمیر جب

بیدار ہوتا ہے تو بہت دیر ہوچکتی ہے سلوچنا کی محبت کی یاد اُسکی زندگی ہے۔ گویا پریم چند نے انسان کے ضمیر کی آواز کو مردہ نہیں دکھایا ہاں معاشرتی دباؤ سے یہ دب ضرور جاتی ہے مگر دل کے کسی کونے میں محبت کی جڑیں گڑی ہوتی ہیں جو انسان کو تاعمر پچھتا وے کی آگ میں جلاتی ہیں۔

اسی طرح کا ایک اور کردار پریم چند کے افسانہ انسان نما حیوان ۱۵ پروفیسر امبکا پرشاد ہے جو باہر آزادی نسواں پر تقریر کرتا ہے اور گھر میں اپنی بیوی پر ظلم روا رکھتا ہے بیوی مرجاتی ہے تو اندر کا انسان جاگتا ہے مگر بہت دیر ہوچکی ہے یہاں پریم چند نے انسان کی منافقت اور ریا کاری کو بے نقاب کیا ہے کہ حیوان انسان کے روپ میں پھرتے ہیں اور یہ کہ انسان اگر پستی میں گر جائے تو اُس کی گراوٹ کی کوئی حد نہیں۔ اپنے سے کمزور پر ظلم کہاں کی انسانیت ہے۔ پریم چند نے اپنے کمال فن سے معاشرتی انسان کے کتنے روپ دکھائے ہیں ڈاکٹر انور سدید کی رائے دیکھیں:

> ''عام فرد کی ذہنی الجھنوں ، سماجی بندھنوں اورمعاشرتی پیچیدگیوں سے پیدا ہونے والے غموں اور سکھوں کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی پریم چند کی عطا یہ ہے کہ اُنہوں نے حقیقت کی نقاب کشائی کی اور انسان کو صداقت کا کھر درا چہرہ دیکھنے پر آمادہ کیا۔'' ۱۶

پریم چند نے معاشرتی پیچیدگیوں اور سماجی بندھنوں کے دکھوں کو اجاگر کرتے ہوئے اپنا تخلیقی سفر جاری رکھا اس ارتقائی سفر کا نقطہ عروج ہمیں ان کے افسانہ پوس کی رات اور انتہا کفن میں نظر آتی ہے۔ پوس کی رات حقیقت نگاری سے اشترا کی حقیقت نگاری تک جا پہنچتا ہے یہاں انسان کا تصور مجبور محض کا ہے تقدیر کی چکی میں پستے ہوئے انسان زمینداری نظام اور سودی نظام کے مارے ہوئے انسان، پوس کی رات میں ٹھٹھرتے نظر آتے ہیں اس سلسلے میں ڈاکٹر احسان الحق کا تبصرہ دیکھیں:

> ''پوس کی رات اُس مفلس کسان کی بے بسی اور بے چارگی کی تصویر ہے جس نے ایک ایک پیسہ جمع کر کے تین روپے بنائے کہ کھیت میں راتیں بسر کرنے اور جارے سے محفوظ رہنے کے لیے کمبل خریدے گا۔ ہلکو نے جب انتہائی بے بسی کے عالم میں تین روپے نکال کر کسان کے کارندے کو دیے تو اسے یوں لگا کہ اُس نے اپنا کلیجہ نکال کر دے دیا ہے۔'' ۱۷

مجبوری اور بے بسی کا یہ عالم ہمیں قضا وقدر کے فلسفے سے میل کھاتا نظر آتا ہے کہ جہاں انسان تقدیر کے ستم کے ہاتھوں ایک کھلونا ہے۔ افسانہ کفن میں بدھیا کی بے بسی اور مادھو کی بے حسی، معاشی اور معاشرتی تضاد سے بھرے معاشرے کے منہ پر طمانچہ ہیں وہاں انسان کے احساس کے لیے ایک تازیانہ کا کام بھی دیتے ہیں'' کفن'' پریم چند شاہکار افسانہ ہے جس میں انسان کے روپ اور بہروپ ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ مادھو اور گھیسو دونوں غریب اور پیٹ کے پجاری ہیں بدھیا کے کفن کے پیسے کھانے پینے اور شراب میں خرچ کر کے سوچتے ہیں جہاں سے پہلے پیسے آئے تھے پھر آجائیں گے اور پھر ایک جواز کفن کونسا ساتھ جاتا ہے بیوی مرجاتی ہے مگر ان کے کھانے کا بندوبست ہوجاتا ہے ایک دن کی عیاشی ہوجاتی ہے۔ انسان کا کتنا کمینہ روپ ہے کہ ایک کی موت سے دوسرے کا پیٹ بندھا ہے بدھیا مری تو انہیں پیسے ملے ورنہ کوئی دیتا نہ تھا۔ یہاں ایک اور حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ انسان پیٹ کے دوزخ کے ہاتھوں کتنا مجبور ہے اور جب پیٹ بھرتا ہے تو عیاشی پر اتر آتا ہے۔ خودغرضی انسان کی سرشت میں ہے اور موقع ملتے ہی انسان اپنی اوقات پر آجاتا ہے بہو کی صرف ایک اچھائی انہیں یاد ہے کہ مرتے مرتے بھی

ان کے کھانے کا بندوبست کرگئی ''کفن''میں انسان کا مرکز ومحور پیٹ ہے ۔مادھواور گھیسو اس نا قابلِ تردید حقیقت کے ترجمان ہیں کہ احلاق ہو مذہب ہو یا سماجی ریت ورسم یہ سب بھرے پیٹ کی ڈکاریں ہیں پریم چند کا اصل مقصد اصلاحی ومعاشرتی ہے۔ پھر بھی پریم چند کا ادب پراحسان ہے کہ انہوں نے عام زندگی اور اس کے مسائل کو افسانوی روپ میں پیش کیا پریم چند کے فن پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

''پریم چند نے اپنے نادلوں اور کہانیوں کے ذریعے ذہن وفکر کو جو عطیہ پیش کیا وہ انسانیت کا شعور تھا۔ یعنی اُس انسانیت کا جس میں انسانی مساوات اور عالم گیرانسانی یگانگت وقربت اساسی حقیقت رکھتی ہے۔ پریم چند کے ادب میں ان سماجی اور معاشی مسائل کا حل ہے جو اس مظلوم اور ایک لحاظ سے گنگی دیہاتی مخلوق کو شب وروز پیش آتے ہیں مگر وہ ان کو یا تو تقدیر کا نوشتہ سمجھتے ہیں یا اسے انسان کی فطری مقہوری پر معمول کرتے ہیں، یا پھر انسانی فطرت کی برائی خیال کرتے ہیں۔'' ۱۸

''سوا سیر گھیوں''میں غریب اور سادہ لوح شنکر کا مذہب کا ہاتھوں استحصال بھی پریم چند نے دکھایا ہے سادہ اور معصوم انسان اور عیار انسان کے دونوں روپ دکھائے ہیں بیسویں صدی کے پہلے عشرہ میں مذہب کا لبادہ اتارنا بھی پریم چند کی ہمت ہے کہ اس عہد میں مذہب کی مقدس گائے پرچھری رکھنا دل گروے کا کام تھا۔لکھتے ہیں۔

بچے دانہ دانہ کو ترستے تھے لیکن شنکر چپ چاپ تماشا دیکھنے کے سوااور کچھ نہ کرسکتا تھا وہ گہیوں کے دانے کسی دیوتا کی بددعا کی طرح تمام عمر اس کے سر سے نہ اُترے۔ ۱۹

پریم چند کا افسانوی عہد بیسویں صدی کی پہلی دہائی ۱۹۰۸ء سے شروع ہوا پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی۔اس وقت رومانوی تحریک بھی چل رہی تھی اور اصلاح معاشرہ کی تحریکیں بھی متوازی سفر میں تھیں۔ اُنہوں نے پہلی جنگ عظیم کی تباہ کاریاں دیکھیں بربادیوں کے کھنڈر اور ویرانے بھی منظر نامے پر تھے برصغیر براہ راست تو اس عالمی جنگ میں ملوث نہ تھا مگر انگریز چونکہ برصغیر کے حاکم تھے اور یہ جنگ میں براہ راست ملوث تھے لہٰذا ہندوستان میں اس جنگ کے اثرات بہت واضح ادیبوں اور شاعروں کے ہاں دیکھے جاسکتے ہیں میرزا ادیب رومانوی تحریک کے نمایاں ادیب تھے صحرانورد کے خطوط میں ان کے یہاں انسان کا لہولہو تصور نظر آتا ہے لکھتے ہیں:

''فتح کی صبح اس وقت نمودار ہوتی ہے جب بے شمار انسانوں کی زندگیاں موت کی تاریکی میں تڑپ تڑپ کر جان دے دیتی ہیں ۔صرف ایک انسان کی عظمت کا چراغ روشن کرنے کے لیے لاتعداد انسانوں کے خون کو تیل بنا دیا جاتا ہے۔ ابتدائے آفرینش سے انسان انسانوں کے خون سے ہولی کھیلتے چلے آرہے ہیں۔تخلیق کائنات سے لے کر اب تک انسانوں ہی کے ظلم کا سیل بے پایاں انسانیت کے زخمی سینے سے ٹکرا رہا ہے۔'' ۲۰

پہلی جنگ عظیم نے انسانیت کو تباہی سے دوچار کیا لیکن اس کے ردعمل کے طور پر انسانوں میں اپنی بقا کا احساس بھی پیدا ہوا غلام قوموں میں آزادی فکر سے آزادی رائے اور آزادی حاصل کرنے کی امنگ جاگی بدلتی سوچ کے اظہار کا پیرایہ بھی نیا تھا اور سانچہ بھی ۔غلام ہندوستان میں ترقی پسند سوچ کے مالک سجاد ظہیر پروفیسر احمد علی ،ڈاکٹر رشید جہاں اور صاجزادہ محمودالظفر

نے افسانے میں حقیقت نگاری اور بے باکی کو رواج دیا اور ۱۹۳۲ء میں ان کا افسانوی مجموعہ ''انگارے'' سامنے آیا سجاد ظہیر نے جنس کے شجر ممنوعہ کو چھونے کی جسارت کی۔ ان کا افسانہ ''جنت کی بشارت'' اور دلاری جنس اور مذہب کو معاشرتی پس منظر میں پیش کرتا ہے۔محض شکم پروری اور اپنے مفادات کے لیے مذہبی احکامات کو استعمال کرنا مذہبی رہنماؤں کا شیوہ تھا شاعری میں تو ان کو ہدف ملامت بنایا گیا مگر نثر میں انگارے اور سجاد ظہیر کے افسانے نے ان کے چہرے سے پردہ کھسکا دیا تو ہاہا کار مچ گئی پریم چند کے یہاں سادہ حقیقت نگاری ہے جبکہ سجاد ظہیر نے جس طرح اپنے سادہ اسلوب کی مدد سے ایک غریب اور بے بس لڑکی دلاری کے جنسی استحصال کی کہانی بیان کی ہے اس کی بدولت وہ روایتی حقیقت نگاری کے مروجہ دائرہ میں وسعت پیدا کرتے ہیں نظر آتے ہیں۔۲۱

انگارے صرف نام ہی نہیں واقعی دہکتے ہوئے انگارے تھے کہ جن سے مذہب و معاشرت کی بنیادیں سلگنے لگیں معاشرے کے محافظ انگارے کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور شاید ہی کوئی اخبار ایسا بچا ہو جس میں اس کے خلاف نہ لکھا گیا ہو اور اس کی ضبطگی کا مطالبہ نہ کیا گیا ہو انگریز سرکار نے ایک تیر سے دو شکار کئے حاکموں نے ان افسانوں کے پسِ پردہ اس بیداری کی بو سنگھ لی تھی جو ان کی حکومت کے لئے خطرہ بن سکتی تھی سو حکومت نے انگارے ضبط کرنے کا حکم دیا مگر بند باندنے سے سیلاب کہاں رکتے ہیں ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آ گیا بعقول ڈاکٹر محمد کامران ''انگارے'' اس تحریک کی بنیاد اور نئے اردو افسانہ کا نقطہ آغاز قرار دیا جاتا ہے۔کہ اس نے اردو ادب میں جرات اظہار اور بے باکی کی طرح ڈالی۔ڈاکٹر رشید جہاں نے عورت کے مسائل کا بھرپور طریقے سے اظہار کیا اُن کے ہاں عورت کا تصور مظلوم اور بے بس انسان کا ہے جس پر ایک انسان ہی ستم ڈھا رہا ہے اور یہ انسان کوئی اور نہیں اُس کا اپنا مجازی خدا ہے شوہر ہے جس کے جبر کا وہ نشانہ بنتی ہے انگارے ۱۹۳۲ء میں منظرِ عام پر آیا جبکہ پروفیسر احمد علی کا افسانوی مجموعہ ''شعلے'' ۱۹۳۶ء میں منظرِ عام پر آیا۔اُن کے افسانہ ''تصویر کے دورُخ'' میں نئی اور پرانی تہذیب کا تقابل کرتے ہوئے انسان کے دوغلے روپ کو سامنے لایا گیا ہے کہ آزادی اور اظہار رائے نئی تہذیب کا حسن ہے جبکہ پرانی تہذیب میں منافقت اور بناوٹ ہے انسان نے روپ بدلا ہے ورنہ انسان ویسے کا ویسے ہی ہے ہاں کھوکھلی تہذیب ایک پردہ ضرور ہے جبکہ نئی تہذیب اس پردے کو چاک کر کے حقیقت سامنے لے آتی ہے افسانہ چھپر کھٹ میں طوائف زادی اور گھریلو عورت کا تقابل ہے مگر طوائف بھی عورت ہی ہے طوائفیت اس کا پیشہ ہے جنس نہیں جبکہ ''غلامی'' میں ایک کسان کا روپ غلام کا ہے جو اپنی غریبی کی وجہ سے مجبور ہے۔۲۲

احمد علی کے'' شعلے'' اور منٹو کے'' آتش پارے'' میں ایک قدر مشترک ہے جنوری ۱۹۳۶ء میں سعادت حسن منٹو کا پہلا افسانوی مجموعہ'' آتش'' منظرِ عام پر آیا۔انگارے، آتش پارے، شعلے ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۶ء تک چار سالوں مین یہ تین کتابیں نہیں ادبی آتش فشاں تھے انگارے اور شعلے تو ایک ہی سلسلے کی دو کڑیاں تھیں مگر آتش پارے، کہاں لکھنو اور کہاں امرتسر پھر مصنفین آپس میں ملے بھی نہیں مگر سوچ اور افکار میں ایک چیز مشترک تھی اشترا کیت۔منٹو باری علیگ اشترا کی ادیب کا پروردہ جبکہ احمد علی اور سجاد ظہیر مغربی تعلیم یافتہ مغربی ادب سے شغف رکھنے والے۔سعادت حسن منٹو بھی مغربی ادب میں دلچسپی رکھتے تھے انھوں نے ''عالمگیر'' کا ''فرانسسی ادب نمبر'' اور'' ہمایوں'' کا ''روسی ادب نمبر'' مرتب کیا تھا اُن کا افسانہ'' تماشا'' پہلی دفعہ'' خلق'' میں ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا خلق کا انجام بھی انگارے سے مختلف نہ تھا خلق کی ضبطی کا حکم بھی سرکار نے جاری کیا۔کیونکہ خلق کے

ایڈیٹر باری علیگ اشتراکی ادیب تھے۔''تماشا'' جیسا افسانہ سونے پر سہاگہ ہو گیا گو کہ یہ مصنف کی پہلی کوشش تھی مگر جلیاں والا باغ کا سانحہ اس کا پسِ منظر تھا۔عوام نے تو اس کی مخالفت نہ کی مگر حکومت میں باغیانہ روش برداشت کرنے کا حوصلہ نہ تھا منٹو نے اپنے افسانوی ادب کا آغاز سیاسی افسانوں سے کیا۔آتش پارے کے تمام افسانے منٹو کی باغیانہ روش اور ایک مکمل سیاسی انسان کا تصور پیش کرتے ہیں۔آتش پارے کے سرورق پر کتاب کے نام کے نیچے منٹو نے لکھا ہے۔''چند فکر طلب افسانوں کا مجموعہ''اور دیباچے میں لکھا ہے:

''یہ افسانے دبی ہوئی چنگاریاں ہیں ان کو شعلوں میں تبدیل کرنا پڑھنے والوں کا کام ہے امرتسر ۵ جنوری ۱۹۳۶ء سعادت حسن منٹو'' ۲۳

اس میں کل آٹھ افسانے شامل ہیں پہلا افسانہ''خونی تھوک''غلامی اور جبر واستحصال کے خلاف نفرت کا اظہار ہے جبکہ دوسرا افسانہ''انقلاب پسند''معاشرتی تضاداور معاشی ناہمواریوں کے خلاف کھلم کھلا بغاوت ہے یہ افسانہ پہلی دفعہ علیگڑھ میگزین میں شائع ہوا تھا''تماشا''طاقت کا امتحان دیوانہ شاعراور چوری۔یہ سب انقلاب کے نقیب ہیں یہاں منٹو کا سیاسی انسان اپنے سیاسی نظریات کا پرچار کرتا نظر آتا ہے حکومت اس کی طاقت سے خوفزدہ نہیں بلکہ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہے گویا انقلاب کی زمین ہموار ہو رہی تھی لیکن حیرت کی بات ہے کہ انگارے کے خلاف طوفان کھڑا کرنے والوں نے آتش پارے اور شعلے کے خلاف آواز بلند نہ کی۔اس کی دو وجوہات تھیں ایک یہ کہ آزادی حاصل کرنے کا خواب ہر ہندوستانی کے دل میں تھا گو اس کا انداز اظہار مختلف تھا۔دوسرا یہ کہ انگارے سیاسی نہیں معاشرتی افسانوں پر مشتمل تھا۔اس معاشرے میں جو اندر سے کھوکھلا ہو چکا تھا مگر باہر سے تہذیب یافتہ کہلاتا تھا جہاں کے انسانوں کے ظاہر و باطن میں تضاد،قول وفعل میں بُعد اور دلوں میں بغض وکینہ تھا۔یہ اپنے بہروپ کے پردے کو چاک کرنے پر انگارے کے خلاف متحد ہو گئے تھے جبکہ آتش پارے سے اگر کسی کو خدشہ تھا تو وہ حکومت تھی جس کی توجہ اور بہت سی چیزوں پر تھی اگر کوئی اخبار یا رسالہ آتش پارے کے خلاف آواز اُٹھاتا تو اس کی ضبطی بھی یقینی تھی کیونکہ منٹو میں تو بھگت سنگھ بننے کی تمام صلاحتیں موجود تھیں۔

یہاں حیران کن امر یہ ہے کی انگارے کے مصنفین نے معاشرتی بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالا اور ہاہا کار مچ گئی۔لیکن معاشرے کے ناسور دکھانے والے بعد میں سیاسی انسانوں کے روپ دکھانے لگے۔ادب کہیں پیچھے رہ گیا سیاست اور اشتراکت ہر طرف چھا گئے ان کے ادب میں اشتراکی انسان اپنے ہتھوڑے اور درانتی سے لیس معاشرے کی طبقاتی اور معاشی ناہمواریوں کو ہموار کرتا نظر آتا ہے جبکہ آتش پارے کے سیاسی انسان کا ارتقا معاشرتی انسان کی شکل میں نظر آتا ہے''نیا قانون'' کا منگو کوچوان اپنے سیاسی شعور کی قیمت جیل کی سزامیں پاتا ہے مگر اس کا دوسرا روپ معاشرتی ہے نعرہ کا کیشو لال منگو کوچوان کی ارتقائی شکل ہے جو اپنی ذات کی شکست وریخت کا آتش فشاں اٹھاتے پھرتا ہے یہاں ہمیں معاشرتی انسان کا وہ روپ نظر آتا ہے جو برصغیر کے غریب انسانوں کا نمائندہ کردار ہے بےبسی اور بےکسی جن کا مقدر ہے قہر درویش برجان درویش کا معاملہ ہے۔یہ لوگ اپنے احساس کی چتا میں جلتے جلتے راکھ ہوجاتے ہیں مگر تقدیر ان پر مہربان نہیں ہوتی یہ کیڑے مکوڑوں کی جیسی مخلوق انسانوں کی شکل میں ہمارے سامنے آتی ہے کہ روندے جانا جن کا مقدر ہے۔

منٹو کے ہم عصروں میں عصمت چغتائی، راجند رسنگھ بیدی،کرشن چندر، اوپندرناتھ اشک،غلام عباس،اوراحمد ندیم

قاسمی اُردو افسانوی ادب میں نمایاں حثیت رکھتے ہیں۔عصمت چغتائی نے لحاف لکھ کر معاشرہ کے رستے ناسوروں کی طرف توجہ دلائی اور انسانوں کا خصوصاً عورت کا وہ روپ دکھادیا جو مرد کی بے وفائی اور بے اعتنائی کی وجہ سے ہمارے سامنے آتا ہے۔گو عصمت نے گھریلومعاشرت کی عکاسی کی بے ساختہ جملے لکھے مگر عورت کے سطحی روپ کو ہی نمایاں کیا ہے۔اس کے یہاں ہمیں ظاہری روپ اور اس کے مسائل نظر آتے ہیں گویا عصمت کا انسان کا تصور سطحی ہے اُس کے احساس اور جذبات کے تہہ خانوں تک عصمت کی نظر نہیں جاتی۔منٹو کے بعد کے آنے والوں میں قدرت اللہ شہاب کا تصور انسان ''یا خدا'' میں بہت واضح ہے۔ ممتاز مفتی نے جنس اور نفسیات کو موضوع بنایا۔تو محمد حسن عسکری کے افسانے بھی انسان کی پرت در پرت نفسیات کو پیش کرتے ہیں'' پھسلن''،اور''حرام جادی'' بھی تصور انسان کی ایک کڑی ہے جو اپنی فطرت سے مجبور ہے۔اور جب جذبات کے نکاس کی فطری راہیں مسدود کردی جائیں تو یہ غیر فطری نکاس کا رستہ اپنا لیتے ہیں۔کیونکہ انسان اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور ہے۔اس کی مٹی ہی کچھ اس انداز سے ڈھالی گئی ہے کہ وہ جذبات سے مغلوب ہو جاتا ہے۔یہ جذباتی انسان نہیں بلکہ فطری انسان ہے کہ جس میں جذبات نہ ہوں تو وہ صرف مجسمہ رہ جائے بے جان مجسمہ۔انیظار حسین کا ''آخری آدمی'' موجودہ زمانے کے آدمی کی بے حسی کی تصویر ہے جہاں آدمی بہت ہیں مگر انسا دعنقا ہے

اُردو افسانے میں تصور روایت مختلف انداز میں سامنے آتی ہے اور یہ روایت زمانے کے ساتھ ساتھ ارتقاپذیر ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر زمانے میں انسان کا بہترین مطالعہ صرف انسان ہی ہے۔

حواشی:

۱۔ علی ثنا، بخاری، ڈاکٹر سعادت حسن منٹو (تحقیق) لاہور: منٹو، اکادمی، ۲۰۰۶ء، ص:۱۳۲
۲۔ یلدرم، سجاد حیدر، خیالستان، مرتب معین الرحمٰن ڈاکٹر سیدہ، لاہور: تاج بک ڈپو،۱۹۹۲ء، ص:۱۵۶
۳۔ سجاد انصاری، محشر خیال، مرتبہ خواجہ منظور حسین، ترتیب لو، ڈاکٹر سیّد عامر سہیل، ملتان: بیکن بکس ۲۰۰۲ء، ص:۴۷
۴۔ ایضاً، ص: ۱۰۵
۵۔ ایضاً، ص: ۱۷۲
۶۔ ایضاً، ص: ۱۰۹
۷۔ ایضاً، ص: ۱۱۰
۸۔ سعادت حسن منٹو (تحقیق)، ص:۱۳۶
۹۔ راشد الخیری، علامہ ناول وافسانے، لاہور: سنگِ میل پبلیکیشنز ۱۹۹۹ء، ص: ۱۱۱
۱۰۔ ایضاً، ص:۶۴
۱۱۔ منشی پریم چند، مجموعہ منشی پریم چند، لاہور: سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۰۲ء، ص: ۸۴۵
۱۲۔ ایضاً، ص: ۴۱۵
۱۳۔ ایضاً، ص: ۳۳۸

۱۴۔ ایضاً،ص:۵۶۳

۱۵۔ ایضاً،ص: ۱۸۷

۱۶۔ انور سدید،ڈاکٹر ، اُردو ادب کی تحریکیں،کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان ، باب چہارم ،۱۹۹۹ء،ص:۴۶۵

۱۷۔ محمد احسان الحق،ڈاکٹر، افسانہ کافب اور پریم چند کے افسانے ،لاہور: الوقار پبلیکیشنز ،۲۰۰۴ء،ص:۸۸

۱۸۔ سید عبداللہ،ڈاکٹر ،مباحث،لاہور: مجلسِ ترقی وادب ۱۹۶۵ء،ص:۲۹۷

۱۹۔ پریم چند،ترقی پسند افسانے ،مرتبہ ڈاکٹر سید میراج نظرہ ،لاہور: الوقار پبلیکیشنز ،۲۰۰۴ء،ص:۴۷

۲۰۔ میرزا ادیب،صحرانورد کے خطوط،لاہور: مقبول اکیڈمی پچاس سالہ ایڈیشن ۲۰۰۶ء،ص:۲۳۴

۲۱۔ ''انگارے''،تحقیق وتنقید از محمد کامران ،ڈاکٹر، لاہور: ماورا پبلیشرز ۲۰۰۵ء،ص:۳۷

۲۲۔ احمد علی پروفیسر شعلے ،لاہور ،مکتبہ اردو ،۱۸۳۸ء، طبع دوم

۲۳۔ علی ثنا بخاری ،ڈاکٹر ،منٹو (تحقیق)،ص: ۱۷۰

☆☆☆